

کھینچتی اربابِ ہمت کو ہین خود و دشواریاں  
دورٹی منزل ہماری رہبر منزل بنی

# دورٹی منزل

ایک لکچر

جو انجمن حمایت اسلام لاہور کے اٹھارویں سالانہ سیمینار

شیخ عبد القادر بنی آئے نے دیا

اور چھپوا کر ہدیہ انجمن کیا

مطبوعہ فناء عام سٹیم پریس لاہور



# دُورِی منزل

دنیا میں انسان کی زندگی کو سفر سے تشبیہ دینا اور انسان کو مسافر اور زندگی کے مختلف مدارج کو مراحل بتانا ایک مقبول تشبیہ ہے۔ البتہ اس مسئلہ کے متعلق کہ اس سفر کی منزل مقصود کون سی ہے۔ اختلاف ہے۔ ایک گروہ ایسا ہے جو قبر کو منزل مقصود سمجھتا ہے۔ اور یہ جانتا ہے کہ زمین کی گود میں جالیٹنا اس زسیت کا انجام ہے۔ دوسرا گروہ ہے۔ جو کہتا ہے۔ کہ یہ عقیدہ دل میں کہٹکتا ضرور ہے۔ کہ اس سارے طمطراق کی انتہا یہی ہو۔ اور خیال آتا ہے۔ کہ کوئی اور زندگی ہونی چاہئے۔ جس میں اس زسیت کی تکمیل ہو۔ اس کے نقائص پر سرزنش ہو اور اس کے کمالات کی داد ملے۔ مگر یقیناً نہیں کہہ سکتے کہ ایسی زندگی ہوگی یا نہیں۔ ایک فریق ہے۔ جو اس بات کا تو یقین کامل رکھتا ہے۔ کہ موجودہ زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے۔ مگر یہ نہیں بتا سکتا کہ اُس کی کیا صورت ہوگی۔ آیا پھر ایک دفعہ جسم خاکی کا پیرا ہن انسان کو پہنا پڑے گا۔ یا اس پیرا ہن کی کچھ بہت بدل جائے گی۔ یا محض روحانی زسیت ہوگی۔ عرض۔

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجا است

ایں قدر است کہ بانگِ جر سے مے آید

اتنا ہے کہ ہر پہلے ہوئے دل میں یہی ایک کہٹکا سا لگا ہوا ہے۔ کہ اس رازِ سربتہ کا جس کا نام دنیا ہے کوئی حل ضرور ہے۔ مگر معلوم نہیں کیا ہے۔ انہی گروہوں میں ایک ممتاز گروہ ہے جو ان مدارج کو طے کر کے بعثتِ بعد الموت کا یقین کامل رکھتا ہے اور اس عقیدہ کے نورانی اثر کو اپنی زندگی کے تنگ و تاریک رستوں میں



چراغ ہدایت بنائے ہوئے۔ منزل کی طرف جس سے رضائے حق مقصود ہے مردانہ دار  
 بڑا جار ہا ہے۔ یہ گروہ اہل اسلام کا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ایک دن آنے کو ہے  
 جب ایک ایک قدم کا حساب کسی عاملیشان حاکم کے حضور میں دینا ہوگا۔ جس کے سننے  
 کوئی بات چہپائے چہپ نہ سکے گی اور جس کے رو پر و ماتمہ اور پانچ خود بول اٹھیں گے۔  
 اس گروہ میں ایک جماعت سالکان راہ کی ہے۔ ان لوگوں کی منزل بہت دور ہے  
 مگر اس کی دوری انہیں ڈراتی نہیں۔ اور رستے کی دشواریاں انکے شہباز بہت کو روکنے  
 کی بجائے اس کے لئے تازیانہ کا کام دے رہی ہیں۔ ان میں سے بعض شریعت کے  
 ہموار اور سید ہے شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ اور بعض طریقت اور سلوک کے نشیب  
 و فراز کی تکالیف اٹھاتے اپنے عزم پر ثابت قدم چلے جاتے ہیں۔ ان سالکان راہ  
 کے سفر کی دستاویزیں اگرچہ نہایت دلچسپ ہیں اور ان کے سفر کی ترقی کا نظارہ  
 اگرچہ چشم حقیقت نگر کے لئے کشش خاص رکھتا ہے۔ مگر اس نظارہ کی جہلک آپ کو دکھانا  
 میرا منصب نہیں۔ یہ واقفان منزل کا کام ہے۔ اور یہ غنیمت ہے کہ اس بزم میں آپ  
 کو ان حضرات کے کلمات معرفت آیات سننے کے موقع مل چکے ہیں اور ملیں گے۔ میں  
 سر دست صرف اس زندگی کے معاملات کے متعلق جس کی راہوں سے میں کسی قدر  
 آشنا ہوں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس زندگی میں باعتبار  
 موجودہ زمانہ کی ضروریات اور حالات کے اس گروہ اہل اسلام کی خصوصاً اس ملک  
 ہندوستان میں منزل مقصود کیا ہونی چاہئے۔ اور اس سے وہ قریب ہیں یا دور۔ اگر  
 دور ہیں تو کتنی دور۔ اور کیا ذرائع ہیں جن سے وہ قُرب مطلوبہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس  
 میں شک نہیں کہ طالبان حق کی نظر میں یہ زندگی اور اس کی منزلیں اور انکے مرحلے پیچ  
 ہیں اور جو دل حقیقت کی پیچ و پیچ راہوں میں گشت کر رہے ہیں۔ ان کی نظر میں مجاز  
 کی راہیں بالکل نہیں جھپٹیں۔ مگر انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ عامۃً خلائق کے لئے یہاں کے



مرحلے اُن بڑے مرحلوں کی تیاری کا کام دے سکتے ہیں۔ اور یہاں کی تلاش و ماں کی جستجو کی معاون ہو سکتی ہے۔ جو لوگ کسی دُہن اور کسی جستجو میں بھی نہیں اور جو سر ہر سوا سے خالی ہیں۔ اُن سے کسی کو بھی کچھ امید نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ یہاں کی منزل تک رسائی کے لئے حق سچی ادا کریں گے۔ اُن سے (اگر خدا انہیں ہدایت نصیب کرے) یہ بھی توقع ہو سکتی ہے۔ کہ وہ اگلے جہاں کی منازل کے طے کرنے کو اور بھی زیادہ مستعد ہوں گے۔ اور جن سے یہاں ہی کچھ بن نہ پڑا تو وہ ان سے بھی مشکل رستوں میں کیا ہمت دکھائیں گے۔ اس لئے جہاں مجتہدین سے کہ جو نقشہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کا میں آج پیش کرنا چاہتا ہوں وہ اہل دنیا کی توجہ کا مستحق ہے۔ وہیں یہ بھی امید ہے کہ اہل دین بھی اُسے بے توجہی سے نہ دیکھیں گے۔ بلکہ اہل دنیا کو اپنی جانب کھینچنے کے لئے اُن کے معاملات سے ایک دلی تعلق پیدا کریں گے۔ تاکہ رہنمائی کا حق پوری طرح ادا کر سکیں +

یہ تو بالعموم متفقہ رائے ہے کہ مسلمانان ہند کی منزل مقصود قومی ترقی ہے۔ کیونکہ انگریزی نیشن کی مثال کے پیش نظر ہونے سے اس ملک کے ہر طبقہ رعایا میں ایک امنگ سی پیدا ہو گئی ہے۔ کہ ہم بھی اُن کی طرح اتفاق اور یکجہتی کے سبق سیکھیں اُنکی طرح میدان ترقی میں بڑھ بڑھ کر قدم ماریں۔ اُن کی طرح ایک دوسرے کے اُپہارے میں مدد دیں۔ اور اُن کی طرح یہ کوشش کریں۔ کہ ہر فرد ساری نیشن کی عزت۔ ساری نیشن کے عروج اور ساری نیشن کی ترقی کا اپنے آپ کو کفیل سمجھے اور مرے لیکن قوم کی عزت میں فرق نہ آنے دے۔ مسلمان اس خیال سے ابتدائے عملداری انگریزی میں کسی قدر بے بہرہ رہے۔ اور چونکہ ابھی تحت و تاج کے دوبارہ آنے کے خواب لے رہے تھے۔ انہوں نے ضروریات زمانہ کو نہ سمجھا۔ اُنہی باتوں میں لگے رہے۔ جنہوں نے تحت و تاج چھوڑ دئے تھے حصولِ علم کو فعلِ عبث سمجھا کئے۔ اور شوقِ ترقی کو



ایک فضول خیال۔ اگر کسی نے بڑھنے کی کوشش کی بھی تو محض ذاتی اغراض کے لئے اور ایک لمحہ بھر کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ وہ کسی جماعت کے افراد میں ایک فرد ہے۔ اور اس جماعت کے بھی کچھ حقوق اس پر ہیں یہ نہ سمجھے کہ اگر وہ جماعت ذلیل ہے تو ان کی اپنی عزت ان سے عام ذلت کا دہشتہ دور نہیں کر سکتی۔ اور اگر جماعت معزز ہے تو ان کا اعزاز اور وہ بلا ہو جائے گا۔ مگر اب زمانہ نے آخر اپنے سیلانی استادانہ سے انہیں بھی خواب غفلت سے ایک حد تک جگا دیا ہے اور یہ محسوس کرنے لگے ہیں۔ کہ ہندوستان بھر میں جب چہہ کر ڈر سے زیادہ مسلمان آباد ہیں۔ اور باوجود عزیب اور نادار لوگوں کی کثرت کے ان میں ہزاروں ذی ثروت اور لاکھوں خوشحال مسلمان بھی نکل سکتے ہیں۔ تو مناسب ہے کہ یہ سب ایک سشتہ الفت میں بندہ جائیں۔ اور اپنی متفرق طاقتوں اور تہمتوں کو جمع کر کے قوم کی ترقی کے لئے متفقہ کوشش کریں۔ یہ ترقی کہنے کو تو ایک لفظ ہے مگر اس میں ایک دنیا بھر معافی کی موجود ہے۔ ترقی یہی تو نہیں کہ کچھ مدارس اور کچھ یتیم خانے اور کچھ انجمنیں قائم کر لیں۔ اور ان کے لئے کچھ چندہ مانگ لیا۔ ترقی اسے بھی نہیں کہتے۔ کہ چند ہزار آدمی پڑھے ہوئے یا اندھوں میں کانے راجے نیم پڑھے مہیا کر لے۔ ترقی اس کا بھی نام نہیں۔ کہ دفاتر سرکاری میں مسلمانوں کے نام معزز عہدوں پر خال خال نظر آنے لگے۔ ترقی سے یہ بھی مراد نہیں کہ کہیں سو پچاس تجارتی کارخانوں میں ایک بڑی کارخانے پر کسی مسلمان کا اسم گرامی لکھا گیا۔ ترقی سے یہ بھی مقصود نہیں کہ ولایت کی یونیورسٹیوں اور مدارس قانونی میں مسلمان طالب علموں کی بھی ایک معقول تعداد ہو گئی یا کچھ مسلمان سیاحت ممالکِ عرب کر آئے۔ یہ اور اس قسم کی بہت سی چیزیں ترقی کی تحریک کے آثار ہیں۔ مگر فرداً فرداً یا سب ملکر بھی خود ترقی نہیں۔ اکثر لوگ اس غلطی میں ہیں کہ ان چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو منزل مقصود قوم قرار دے لیتے ہیں۔ اور اس میں جس حالت میں قوم ہو۔ اس سے ترقی کا اندازہ لگاتے ہیں۔ لیکن یہ مقیاس ترقی



درست نہیں۔ قومی ترقی نام ہے اُس صفت کا کہ یہ سب اور اس قسم کی اور خوبیاں اب کی طرح ادھوری نہیں۔ پوری پوری قوم میں موجود ہوں۔ اور اُن پر یگانگت اور قوت اجتماع کی یہ کیفیت ہو کہ ایک نبض پر انگلی رکھنے سے کل قوم کی نبض معلوم ہو جائے ایک وجود میں حرارت بڑھنے سے ہر نبض تیز تیز چلے۔ ایک نبض کا ساقط ہونا بجلی کی طرح سب نبضوں پر دم بھر کے لئے اثر کر جائے۔ سارے دل ایک جوش سے دھڑکیں۔ اور سارے دماغ ایک سودا سے پڑ ہوں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ کہ ایسی ترقی یافتہ قوم میں جس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اختلاف رائے معدوم ہو جائے یا خیالات میں سب کا اتفاق کلی ہو۔ یہ حالت تو ایک خاندان کے چند افراد میں پیدا ہونی مشکل ہے۔ تو ایک قوم میں کیونکر ممکن ہے۔ لیکن یہ کہ باوجود اختلافات مذہبی اور سیاسی کے باوصفت مختلف مذاق علمی کے باوجود مختلف مشاغل و ذرائع معاش کے ایک جوش قومیت کا سب میں مشترک ہو۔ اور کوئی اس جنوں سے خالی نہ ہو۔ وہ بھی اختلافات جو اس وقت تک انگلستان میں موجود ہیں۔ آج بھی ایک مذہب کو ہی دیکھیں تو اس میں کوڑیوں فریق نکلتے ہیں۔ مگر یہ اصول مسلمہ ہے۔ کہ وہ لوگ پہلے انگلیس ہیں اور پھر کیتھولک یا پراٹسٹنٹ۔ اسی طرح سیاسی فریقوں کا حال ہے۔ کوئی لبرل یا آزادی پسند ہے تو کوئی کنسر ویٹو یا پابند دستور قدیم ہے۔ مگر جہاں انگلیسیت کی بحث آجائے۔ وہاں وہی مقدم ہے۔ اور ساری تفریقیں جو اندرونی طور پر اس شد و مد سے مروج ہیں مٹ جاتی ہیں۔ اور انگلستان کی عزت بچانے کا خیال مقدم ہو جاتا ہے۔ یہی خاصہ ہے۔ جس میں اہل انگلستان اور دیگر ترقی یافتہ قوموں کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے اور یہی تعریف ترقی کی ہے۔ جسے ہم اختیار کیا چاہتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت ترقی کی اتنی شاخیں ہیں۔ جتنی اد پر بیان ہو چکی اور ان سب کے حاصل ہونے کے ساتھ اگر قوم میں مادہ قومیت موجود ہو۔ تب قوم ترقی یافتہ ہو سکتی ہے۔ تو یہ فتوے دینیہ تو اُن کے ہیں کہ مسلمان ابھی اس منزل سے دور ہیں۔ اور بے حد دور ہیں اور میرا مشن آج اتنا ہی ہے



کہ اس دوری کا احساس بعض دلوں میں پیدا کر دوں نہ اس غرض سے کہ وہ کام کو مشکل بلکہ محال سمجھ کر ہمت مار دیں اور بے درست دیا ہو کر بیٹھ جائیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اپنی رفتار ترقی اور تیز کریں اور اپنی کوششوں کو اور بڑھائیں کیونکہ۔

کھینچتی ارباب ہمت کو ہیں خود و شواریاں

دوری منزل ہماری رہبر منزل بنی

ایک عرصہ تک ہمارے ہاں کے لکچر دن کا یہ خاصہ رہا ہے۔ کہ گزشتہ عظمت کے نقشے دکھا دکھا کر دلوں کو نرم کرنا۔ سوتوں کو جگانا اور جاگے ہوئے لوگوں کو شرم دلانا اور غیرت کو جوش میں لا کر انہیں کچھ کرنے پر آمادہ کرنا اور پھر ان کو ایک نزدیک سی منزل انگلی کے اشارے سے دکھانا۔ اس امید سے کہ جس طرح بچوں کو بہلا پھسلا کر ساتھ لے چلتے ہیں اسی طرح اہل قوم کو بھی لے چلیں گے۔ ابتداء کے کار کے لئے تو یہ حکمت علی غالباً درست تھی۔ مگر میرے خیال میں اب اسی حکمت پر کار بند رہنا قوم کی عقل و ذہانت کا ازالہ حیثیت عرفی ہے ہم کب تک بچے ہی بنتے چلے جائیں گے۔ اب وقت ہے کہ ہم اپنے حالات کا ٹھیک اندازہ لگائیں۔ جو قوتیں ہمارے پاس ہیں ان کا جائزہ لیں۔ جو کام ہم کو کرنے ہیں۔ ان کا حساب کریں۔ اور سوچیں کہ موجودہ قوتوں میں کیا اضافہ درکار ہے اور ان کو کس ڈھنگ سے استعمال کرنا چاہئے۔ کہ ہم جلد اپنی منزل پر پہنچیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اب تعلیم کے پھیلنے اور ترقی کے اور آثار پیدا ہونے کے باعث ہم میں ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ جو مذمت قوم کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ جو اس کے لئے ایثار کرنے پر آمادہ ہیں جو دقتوں اور دشواریوں سے نہیں گھبرائیں گے۔ وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ آج تک دنیا کی تواریخ میں ایسا کوئی موقعہ نہیں ہوا کہ کوئی قوم بغیر افراد قوم کی جانفشانیوں اور سر توڑ کوششوں کے قوم بن گئی ہو۔ کوئی نعمت ایسی نہیں جو بغیر محنت کے حاصل ہوئی ہو۔ کوئی راہ ایسی نہیں جو تکلیف سے خالی ہو۔ اور کوئی عمدہ چیز حاصل کرنے



کے قابل ایسی نہیں جس کے ہتیا کرنے میں بہت سی بے کاریاں آزار دہ چیزوں سے سابقہ نہ پڑے۔

تاصد ہزار خار نے روید از زمیں  
از گلنے گلے بہ گلستاں منے رسد

میرا خطاب انہی لوگوں سے ہے اور انہی کو اکسانے کے لئے میں گن ڈالنا چاہتا ہوں کہ باوجود ان کوششوں کے جو مختلف اطراف میں جاری ہیں ابھی کتنی اطراف ہیں جن میں ہم کچھ کام نہیں کر رہے اور جن میں کام شروع کرنا ہم پر واجب ہے۔ انہی اصحاب کو میں یہ جتنا چاہتا ہوں۔ کہ گویا ایک قوم کی اصلاح و بہبودی کے اہم کام کو دیکھ کر یہ خیال ہمارے دلوں میں آئے۔ کہ ہماری کوششیں کیا کر سکتی ہیں۔ جہاں انہیں ترقی کی کل مقدار مطلوبہ سے وہی نسبت ہے۔ جو قطرہ کو دریا سے ہوتی ہے۔ یا ذرہ کو آفتاب سے۔ مگر ہمیں یاد رکھنا چاہئے۔ کہ جب کہی کسی قوم میں اصلاح شروع ہوئی ہے افراد ہی سے آغاز ہوتا ہے۔ کہی ایک جماعت کی جماعت فوراً سدہ نہیں جاتی جس چیز میں خوبی ہو۔ وہ ایک کے اختیار کر نیسے بھی خود بخود پھیلنے لگتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ عالمگیر رواج بن جاتی ہے۔ اور جس کام کی ابتدا دست ہمت سے ہوتی ہے۔ اُس کے انتہا کو پہنچنے تک زور قضا اُس کا شریک حال ہو کر اُسے کامیابی کا متاع عنایت کر دیتا ہے۔

فرہ راتا نبود بہت عالی حافظ  
طالب چشمہ خورشید درخشاں شود

اور اقوام کی آب و تاب اور چمک دمک دیکھ کر تو کمی مسلمانوں کے جی للچاتے ہیں۔ کہ ہم بھی یہی رونق پالیں۔ مگر اس پر غور کرنے والے کم ہیں۔ کہ وہ کس قسم کی بہت راہ ترقی میں دکھا رہی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ وہ بھی منزل سے اتنی ہی دور تھیں۔ جتنے ہم ہیں۔ یا



شاید اس سے بھی زیادہ مگر جب اُن میں باہمت سالکانِ راہ پیدا ہو گئے۔ اُن کی شکلیں آسان ہو گئیں۔ جتنی صدیوں میں مسلمان ایک بنی ہوئی قوم سے تنزل کرتے کرتے ایک بگڑی ہوئی قوم کی حد تک پہنچ گئے۔ اتنی صدیوں میں انگریز ایکس قوم بن گئے۔ چند صدیاں پیشتر انگلستان ایک دور افتادہ جزیرہ تھا۔ جس کی آبادی اُس حالت میں تھی۔ جو اب ہندوستانیوں سے منسوب کی جاتی ہے۔ اور اس میں نہ تو پیداوار اس کثرت سے تھی کہ لوگ خوشحال رہ سکیں نہ صنعت کا زور تھا۔ نہ تجارت کا۔ نہ لباس میں نہ اوضاع و اطوار میں نشاۃِ ثانی کے وہ آثار تھے۔ جن پر آج وہ جزیرہ ناز کرتا ہے اور بجا ناز کرتا ہے۔ نہ ملکی حکومت کی وہ معقول بنائیں تھیں جن کی وجہ سے حکومتِ انگلستان دنیا کی حکومتوں میں امتیازِ خاص رکھتی ہے اور نہ آزادی کی یہ مرتبت اُسے حاصل تھی۔ جو آج قومِ انگریزی کا حصہ ہے مگر انہوں نے باوجود ان سب کیوں کے منزل کو جالیا۔ اور دوری منزل کو یوں کاٹ ڈالا کہ گویا تہی ہی نہیں۔

منزل مقصد قریب ہے گر ہو بہت رہنا

جانگزا سالک کو تکلیفِ سفر ہرگز نہیں۔

خود ان حدودِ ہندوستان کے اندر اندر گزشتہ سو ڈیڑھ سو سال میں ایک انقلابِ عظیم آگیا ہے۔ انگریزوں کی نسبت تو شاید کوئی یہ کہہ دے۔ کہ انگلستان کے جغرافیائی محل وقوع انگلستان کی سرزمین اور انگلستان کی آب و ہوا۔ ان سب کے اثرات اُن کے بنانے میں شامل تھے۔ مگر اس کا کیا جواب ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اسی سرزمین میں جسپر ہم آپ بستے ہیں۔ اسی آب و ہوا میں جس میں ہم آپ رہتے ہیں۔ اسی آسمان کے نیچے ہمارے اپنا۔ اُسے وطن میں سے بہت لوگوں نے اپنی بگڑی بنالی۔ حالانکہ ہم بنی بنائی کہہ بیٹھے۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑا۔ ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے



پارسیوں کو لیجئے۔ ایک غریب الوطن گروہ۔ فلک زدہ حالت میں ایران سے گھر اگر ہندوستان میں پناہ گزین ہوا۔ نقد او میں کم۔ تعلیم سے معرا۔ مذہب آتش پرستی۔ زبان ملکی سے نا آشنا اور رواج سے بے خبر۔ اتنی تو مشکلیں۔ مگر دنوں میں علم کے پتلے۔ ہنرمندی کے ذخیرے اور سلیقہ اور حسن معاشرت کی تصویریں بن بیٹھے ہیں۔ کوئی بڑا شہر نہیں جس میں ایک دو خوش حال پارسی سوداگر نہ ہوں۔ تجارت ہر قسم کی کرتے ہیں۔ مگر شہری۔ معاملہ کے صاف گفتگو میں شیریں۔ انگریزی بولیں اور انگریزی لباس پہنیں تو انگریزی ہی معلوم ہوں۔ دیسیوں میں ملیں جلیں تو بے تکلفانہ۔ زن و مرد جو ہر علم سے آراستہ۔ روشن خیالوں کا ہر معاملہ میں ساتھ دیں۔ اور سلطنت کے مفید اراکین میں شمار ہوں۔ مرہٹے جن کا تذکرہ تاہم ہندوستان میں پہلے لوٹ مار اور رہنمائی کے متعلق ہی سننے میں آتا ہے۔ باوجود سلطنت گوہر میٹھنے کے جو عارضی طور پر انہیں حاصل ہوگئی تھی۔ علم کی دولت سے برابر مالا مال ہوتے جاتے ہیں۔ اور احاطہ بمبئی کے سرکاری عہدوں پر اس کثرت سے ممتاز ہیں۔ کہ بعض اوقات حکام خود محسوس کرتے ہیں کہ زور سارا ان کے ملازمین کے ہاتھوں میں ہے۔ باعتبار علم و فضل اور محبت وطن کے جسٹس رانا ڈے جیسے قابل لوگ ان میں نکلے اور نکل رہے ہیں۔ اور ایثار کی یہ نوبت ہے۔ کہ پونا میں ایک اعلیٰ درجہ کا کالج رکھتے ہیں۔ جس کے سب معلمین مسایاں قابلیتوں کے آدمی ہیں۔ مگر محض گزارہ پر ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور وہ نتائج دکھاتے ہیں کہ بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے مدرس دوسرے کالجوں میں بہ مشکل دکھا سکیں انہی میں پر دنیہ گو کہتے جیسے اشخاص ہیں۔ جو بڑی تنخواہ چھوڑ کر کالج میں گزارہ پر پڑے رہی اور اب کونسل عالیہ میں منتخب ہو کر جا پہنچے ہیں۔ انہی میں مسٹر ریچپی ہیں۔ جنہوں نے دو سال ہوئے کمرچ میں امتحان ریاضیات کا سب سے بڑا درجہ حاصل کر کے یکبارگی ہندوستانیوں کی ذہانت کی نسبت اہل انگلستان کی رائے بدل دی تھی۔ یہ ستر پچھتر روپیہ ماہوار پر اپنے کالج کی خدمت میں مصروف ہیں۔ حالانکہ اگر محکمہ تعلیم سرکاری میں جانا چاہتے۔



تو چار پانچ سو روپیہ کی تنخواہ سے ابتدا ہوتی۔ اور شاید ہزار روپیہ ماہوار یا زیادہ تک پہنچتے۔ یہ صلاحیت مرہٹوں میں کل تک نہ تھی۔ مگر آج ہے۔ اور اسی کا سبب ہے کہ اُن کی قوت قومی دن بدن بڑھ رہی ہے۔ احاطہ بنگال میں وہاں کی کثیر مسلمان آبادی کو چھوڑ کر جس کی حسرتہ حالی حد سے گزری ہوئی ہے۔ بنگالی قوم کو دیکھو۔ تعلیم کے میدان میں اپنی بساط سے بڑھ بڑھ کر قدم مار رہے ہیں۔ اور بعض ایسے بالیاقت آدمی اُن میں نکلے ہیں۔ کہ خود انگریز جن سے اس زمانہ میں ہندوستان تحصیل علم کر رہا ہے۔ اُن کی قابلیت کو نگاہِ تحیر سے دیکھتے ہیں۔ انگریزی بولنے والے ایسے کہ انگلستان میں جا کر مذہبی اور سیاسی امور پر تقریریں کہیں اور فصاحت کا سکہ بٹھا دیا۔ لکھنے والے ایسے کہ اُن کی کتابیں انگلستان میں مقبول ہو رہی ہیں۔ علوم طبعیات میں اُن میں پروفیسر بوس موجود ہے۔ جس کا نام بحیثیت ایک سائنس دان کے یورپ کے ماہرانِ فن عزت سے لیتے ہیں۔ جس صیغے میں دیکھو زراعت میں۔ صنعت میں۔ تجارت میں۔ بڑھتے جاتے ہیں اور بڑھتے جائینگے۔ کیونکہ مادہ قومیت کا بیج اُن میں بویا جا چکا ہے۔ اور قومی ترقی کی راہ پر وہ لگا دے گئے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ بعض لوگ اس قوم کی ہنسی اُڑانا ایک بڑا کمال سمجھتے ہیں اور بڑے شوق سے اُن کی نسبت تمسخر آمیز روایات سناتے ہیں۔ بعض اُن کی بزدلی کے گیت گاتے ہیں۔ شاید پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار نے کہیں ایک قصہ لکھا ہے۔ جو بہت مقبول ہوا ہے۔ وہ ذکر کرتے ہیں کہ ایک بنگالی باجوہا کسی نواب کے ہاں ملازم ہوئے اور ایک دن اُن کو نواب صاحب کے ساتھ شکار میں جانے کا اتفاق ہوا۔ بہت کچھ پہلو تہی کرتے رہے۔ مگر آخر نواب صاحب کا اصرار غالب آیا۔ اور جاتے ہی نہی۔ ایک ہاتھی پر سوار ہوئے۔ پہلے تو ہاتھی پر چڑھنے میں ہی گہبرائے۔ مگر خیر جوں توں کر کے یہ مشکل تو کاٹی۔ شکار میں کہیں کوئی درندہ نظر آیا۔



نواب صاحب کے ہاتھی نے اس کا تعاقب کیا۔ بابو صاحب کے فیلیبان نے جب اُدھر  
 کا رخ کیا تو یہ مارے ڈر کے کانپنے لگے۔ فیلیبان روز ایسے معرکوں کا لہا ہوا تھا۔ اُس کو  
 ان کے ڈرنے پر ہنسی آئی اور اُس نے دل لگی کے لئے ہاتھی کو اور زور سے بانگنا شروع  
 کیا۔ اور بابو صاحب نے اس طرح روکنا۔ ”او پھیل کا باں!۔ او شالے پھیل کا باں! سٹراؤر  
 نہیں تو ہم نواب صاحب سے بولے گا۔“ اُس نے پھر بھی پروا نہ کی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ خود  
 نواب صاحب نے ہی متا شاد دیکھنے کے لئے انہیں ساتھ لیا تھا۔ اس پر بہت جھلائے اور  
 بولنے لگا۔ ”کو نہیں ہم کہہ کرے کلج میں تمہارا برائی کہے گا۔“ ہنسی تو ایسی روایات کے  
 سننے سے آجاتی ہے۔ مگر اُدھر اس ہنسی کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ اس میں کیا کیا۔ جہاں  
 شامل ہیں۔ ایک تو بنگالی بابو کا تشکار میں مددے کی صورت دیکھ کر ڈرنا اور گھبرانا۔ دوسرے  
 کچھ محض بنگالی ہونے کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ شہری ہونے کا نتیجہ تھا۔ بنگالہ کے ہی دیہاتی  
 لوگوں کو دیکھو تو انہیں آئے دن درندوں سے سابقہ پڑتا ہے اور نہیں گھبراتے یہاں بنگالہ  
 میں جو شجاعت اور مردانگی کی کان ہے لاہور یا امرت سر کے کسی ایسے باشندے کو  
 لے لیجئے جسے باہر جنگلات اور دیہات میں جانے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ اور وہ ایسی  
 حالت میں گھبراہٹ ظاہر کرے گا۔ دوسری جزد ہنسی کی اس میں اُرود کی ناقص بنڈتی  
 غلط ترکیبیں اور غلط تلفظ ہے۔ مگر اس میں وہ معذور ہے۔ وہ اس کی اپنی زبان نہیں  
 اور نہ اس نے باضابطہ طور پر اس کی تعلیم پائی ہے۔ تیسری جزد ہے۔ ”کہہ کر کا کلج“  
 جس کی طرف وہ ہر حالت میں دوڑتا ہے اور جو ہر معاملہ میں اس کی آخری پناہ ہے۔  
 اس میں شک نہیں کہ ”کہہ کر کا کلج“ میں بُرائی لکھنے سے ”پہلیبان“ کا تو کچھ نہیں بگڑ سکتا۔  
 مگر ”کہہ کر کا کلج“ اس زمانہ میں بڑے بڑے حاکموں کی جان اپنے پنجے میں رکھتا ہے  
 جن کے سبب ہیں سوائے انگو سوا مشکل ہے

جتنے بلند مراتب پر کوئی شخص پہنچتا جاتا ہے اتنی ہی اسے اخباروں کی رائے کی زیادہ



پر دہوتی جاتی ہے۔ اور وہ چاہتا ہے۔ کہ جہاں تک ممکن ہو سب اس کے موافق ہوں  
 اور جہاں کو مخالف کہتا ہے۔ تو اسے تردد شروع ہوتا ہے۔ یوں تو ہر ایک پر اخباری نکتہ  
 جیسی کا اثر اس کی طبیعت کے موافق ہوتا ہے۔ مگر ایسے آدمی کم ہیں جو بالکل بے اثر ہوں۔  
 میں نے خود بعض بڑے بلند پایہ لوگوں کو دیکھا ہے کہ ایک معمولی سے اخبار کے ہی چند فقرے  
 اُنکے لئے خواب و خور حرام کر دیتے ہیں اور وہ چین نہیں لیتے۔ تا وقتیکہ کہیں اور اس کی  
 تردید نہ چھپو الیں۔ جب طبع انسانی کی یہ حالت ہے تو اخبارات خواہ مخواہ ایک قوت  
 بن جاتے ہیں اور اس پر رفتار زمانہ بھی اس کی مقتضی ہے۔ یورپ کی مثال بھی اس کی  
 تائید کرتی ہے۔ اس لئے جہاں آپ کہیں کالج سنکر ہنستے ہیں۔ میں رشک  
 کرتا ہوں کہ اہل بنگالہ کتنے زیر دست آلات صدا بے قومی بلند کرنے کے رکھتے ہیں اس  
 میں شک نہیں۔ کہ بنگالی اخبارات کی طرز تحریر اور ان کے بعض پولیٹیکل مضامین  
 ہمیں اختلاف ہے اور میں ہرگز انہیں دوسرے ہندوستانی اخبارات کے لئے نمونہ  
 کے طور پر پیش نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن جو قدر اہل بنگالہ اپنے اخبارات کی کرتے ہیں  
 اور جو زور وہ اس صیغے کی ترقی پر دے رہے ہیں۔ بیشک قابل تقلید ہے۔ تعلیم نصاب  
 میں وہ ہم سے بہت آگے ہیں۔ علم ادب کی ترقی میں سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔  
 ناول بعض ایسے لکھے گئے ہیں کہ ان کا انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے۔ اور ڈرامے میں  
 تو انہوں نے جان ڈال دی ہے اور یقیناً ہندوستان کی کسی اذنیان میں دیر تک ڈراما  
 اس رتبہ کو نہیں پہنچے گا۔ جو بنگالی ڈراما نویس حاصل کر چکے ہیں۔ اب انہیں چھوڑ کر شمالی  
 ہندوستان کی طرف آئے اور اس میں اپنے ہندو ہمسائیوں کی حالت پر نظر ڈالئے۔  
 کوٹنا صیغہ ہے جس میں وہ بند ہیں اور کون سی دوڑ ہے جس میں وہ شریک نہیں  
 اگر ہم چند سے اور غافل رہتے تو گوئے سبقت وہ لیجا ہی چکے تھے۔ مگر اب کسی کسی صیغہ  
 میں جہاں مسلمان جا پہنچے ہیں۔ اتنا ثابت ہو گیا ہے۔ کہ برابر کے جوڑ ہیں اور مقابلہ



خاصہ تہا ہوا ہے۔ باعتبار حیسانی اور دماغی قوس کے کسی کو افضل قرار دینا آسان نہیں  
 باقی نحت اور سعی فیصلہ کرتی ہے۔ کہ کون جیتا اور کون ہارا۔ مسلمانوں کے اس اظہارِ وقت  
 کا اثر ہندو اصحاب پر تو یہ پڑا ہے کہ انہوں نے اس پہت کو ہمیز لگائی ہے اور اس کے  
 قدم اور بھی تیزی سے اٹھنے لگے ہیں۔ کیونکہ جب تک کوئی مقابلہ میں نہ تھا۔ تو قدرتی  
 طور پر وہ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ اور اگر کچھ عرصہ اور مقابلہ پیش نہ آتا تو شاید  
 بالعادة سست ہو جاتے۔ مگر وہاں تو مقابلہ سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے اور رفتار  
 زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ خدا کرے کہ مسلمانوں پر بھی اس کا اثر مفید ہو اور یہ مقابلہ دونو  
 قوسوں کے لئے ترقی کی ترغیب و تحریص کا باعث ہو۔ یہ نہ ہو کہ اس تھوڑے سے امتحان  
 میں لائق ثابت ہونے پر مسلمان نڈراں ہو بیٹیں اور سمجھیں کہ بس منزل مقصود یہی  
 تھی۔ یا پھر مقابلہ کی وقتوں سے گھبرا کر کہیں منزل بہت دور ہے کون جان مارے  
 حضرات۔ جس قدر کوئی مقصد عالی ہے اسی قدر اس کے راستے میں دشواریاں  
 زیادہ ہیں۔ ایک آدمی کا ترقی کرنا نسبتاً آسان ہے۔ مگر ایک قوم کا بڑھنا اور پھر گری  
 ہوئی قوم کا۔ بہت سی مشکلات رکھتا ہے۔ مگر آیا کسی کوشش کرنے والے کے لئے  
 کوئی اس سے اعلیٰ کوئی اس سے عمدہ۔ کوئی اس سے زیادہ قابل تعریف مقصد ہو سکتا  
 ہے۔ کہ وہ گرے ہوئے کو سنبھالے۔ ہرے ہوئے کو ابھارے۔ تہک کے بیٹھے  
 ہوئے کو اٹھائے۔ اٹھنے والے کو دوڑائے۔ اور دوڑنے والے کو با د از بلند پکار  
 کر کہے۔ "ہاں بڑھے چلو"۔ جتنا یہ مقصد نیک ہے اتنی ہی اس کا عزم رکھنے والوں  
 کی شامت آتی ہے۔ کوئی انہیں خود عرض ہڑاتا ہے۔ کوئی مسکار اور کوئی گدا۔ مگر یہ  
 کب گھبرانے والے ہوتے ہیں۔ بڑا کہنے والوں کو یہ بہلا کہتے ہیں۔ اعتراض کرنے  
 والوں کا یہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہر شخص کی دلجوئی کرتے ہیں۔ ہر ایک سے بہ تواضع  
 پیش آتے ہیں۔ جو کام غریب سے نکل سکے۔ اس میں سختی کو دخل نہیں دیتے۔ حصول



مطلب پر نظر رکھتے ہیں اور اس کے لئے وہ باتیں گوارا کرتے ہیں جنہیں لوگ ذلت سمجھیں۔ اور آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ملے گا جھک کے ملنے سے نشانِ منزل مقصد

خدا ننگِ مدعا زہ کرنے والی یہ کمانیں ہیں (حبیب)

یہ ہے روشِ ان لوگوں کی جنہوں نے دنیا میں کچھ کر کے دکھایا ہے اور ایسی ہیں راہیں جو ترقی کی منزل کی طرف جاتی ہیں۔ اگر آپ ان پر چلنے کے لئے آمادہ ہیں تو آئے بسم اللہ کیجئے۔ اور چلنے سے پہلے ان کی صعوبتوں کی تفصیل پیش نظر رکھ لیجئے۔ کیونکہ منزل کی واقفیت لازمی ہے۔

گرچہ راہ است پر از بیم زباتا بر دست

رفتن آساں بودار واقفِ منزل باشی

سب سے بڑا خطر جو ہماری راہ میں ہے۔ اور جس کے برخلاف مسلح ہو کر ہمیں چلنا چاہئے وہ تفرقہ ہے۔ میں نے چند سال ہوئے اسی جلسہ میں بیان کیا تھا۔ کہ ہماری ترقی کا خواب کس طرح کثرتِ تعبیر کے سبب پریشان ہو رہا ہے اور کس طرح بعض بے درد اور بے اصول لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی اعتراض پوری کرنے کے لئے قوم کے گلے پر چھری پھیر رہے ہیں۔ کوئی صرف اس لئے ایک مجلس قائم کرتا ہے کہ اس کے نام کے ساتھ سکریٹری یا پریسیڈنٹ کا لقب لکھا جائے۔ آگے تو زمانہ کا یہ دستور تھا کہ ع

ہر کہ شمشیر زندہ سکے بنامش خوانند

مگر اب زمانہ بدلتا جاتا ہے۔ ہر ایک میں نگاہیں جواب بھی اس اصول کی پابند ہیں اور کسی ایسے شخص کو جو حقیقت میں شمشیر زن نہ ہو اور صرف لہو لگا کے شہیدوں میں ملنا چاہے کوئی وقعت قومی اعتبار سے نہیں دیتیں۔ مگر عوام کی کیفیت ہے کہ جو کوئی اکٹھے گئے لاف زنی کر دے کہ میں تپنیں ہوں اور چناں ہوں۔ اور میں نے فلان سنا



میں یہ کام کیا اور فلان موقعہ پر یہ کیا۔ اور پرانے زمانے کے مرثیہ خوانوں کے اونے طبقہ کی طرح دوچار بسورے ساتھ رکھے۔ جو اُس کی اثنائے گفتگو میں کبھی آہ کہیں اور کبھی واہ اور کبھی "حق اللہ کا نعرہ بلند کر دیں۔ اور ایک دوسوز خواں رکھے۔ جو اس کے ہم آہنگ ہوں۔ وہ لیڈری کے خواب لیتا ہے۔ اور جھلا ہیں کہ اُس کے ساتھ بھی ہو لیتے ہیں۔ اور نہ صرف جھلا بلکہ چبڑ ہوئے بہالے سید ہے خواندہ اور ذی عزت لوگ بھی جن سے زیادہ عقلمندی کا ثبوت ملنا چاہئے تھا۔ اس کا نام صلح کل قرار دیتے ہیں کہ چھوٹے کو چھوٹا نہ کہا جائے اور ایک اہم قومی فرض سے جو تمیز حق و باطل کے بارہ میں اُن کے دئے ہے پہلو تہی کرتے ہیں۔ اور اس طرح قوم کی مجد و وقوت متفرق ہو کر منتشر ہو جاتی ہے اور وہ کام جو فی الحقیقت تکمیل تک پہنچانے کے لائق ہیں۔ اوہورے رہ جاتے ہیں۔ تفرقہ کی ایک اور صورت ہے جو اس سے کم قابل اعتراض ہے۔ مگر جس میں بہت سے خطرات پنہاں ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہر مقام کا یہ میلان ہے۔ کہ وہاں ایک مقامی جماعت قومی اغراض کی کفیل ہو۔ اگر اس میلان میں اس احتیاط سے کام لیا جاوے۔ کہ اصول و اغراض ان جماعتوں کے ہر جگہ یکساں ہوں اور ہر مقامی جماعت کسی مرکز سے وابستہ ہو۔ اور وہ مرکز کسی بڑے مرکز سے رشتہ یگانگت رکھتا ہو۔ اور مرکز سے کچھ مدد کچھ مشورہ کچھ فائدہ مثال شاخوں کو پہنچتا رہے۔ اور شاخوں سے کچھ ہمدردی کچھ امداد مالی اور کچھ جوش مرکز کی طرف متحرک رہے۔ تو اس میلان سے اچھا میلان کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے ذریعے تمام منازل مطلوبہ طے ہو سکتی ہیں۔ مگر جب واقعی حالت کو دیکھتے ہیں تو یہ منزل ابھی بہت دور نظر آتی ہے عموماً یہ ہوتا ہے۔ کہ چند نیک خیال اور ہمدرد دل ایک مقام میں جوش قومی کے زور میں ایک جماعت بناتے ہیں اور اس کو اپنے طور پر چلانا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ اُن کے معاون بنتے ہیں۔ تھوڑا سا کام شروع ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہر ابتدائی کام کا دستور ہے۔



مصارف زیادہ ہوتے ہیں اور مفا و نسبتاً کم۔ بعض ہمتیں اسی تہوڑے سے استھان پر  
 پست ہونی شروع ہوتی ہیں۔ کچھ ہمدردی گھٹنے لگتی ہے۔ کچھ آمدنی کم ہوتی ہے۔ کارکن  
 مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی عزت قائم رکھنے کے لئے جو وسائل بن پڑیں استعمال میں لائیں  
 سرمایہ کے لئے سخت کوشش شروع ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں کسی ایسی جماعت کا جو کسی  
 مرکز میں ہے کہیں شامت کا مارا کوئی ایجنٹ وہاں جا پہنچتا ہے۔ اب مقامی ضرورت  
 اور مرکزی ضروریات میں خواہ مخواہ ایک بحث پیدا ہوتی ہے۔ مقامی اصحاب کہتے ہیں  
 "جائے حضرت آپ کے ہاں سے ہمارے شہر کو کیا نفع پہنچتا ہے۔ اول آپ کے ہاں  
 ہوتا ہی کیا ہے۔ اس میں یہ عیب ہیں۔ یہ نقص ہیں" اور سے سرگرم ایجنٹ صاحب  
 اٹھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "اے مسلمانو! کہوں گمراہ ہو رہے ہو۔ ان چھوٹی چھوٹی ٹیڑھ  
 اینٹ کی مسجدوں سے کیا نتیجہ ہے۔ ایک بڑی عالیشان عمارت کی مدد کرو۔ جس  
 میں سب کا نام نکلے۔" اس طرح بجائے اتفاق اور اتحاد اور یکجہتی بڑھنے کے جھگڑے  
 اٹھتے ہیں گو بعض فہیدہ لوگ ایسے ہیں۔ جو ہر فرض کی اہمیت کے درجہ کو سمجھتے ہیں اور  
 سب فرائض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر عام طور پر اس کا برا  
 اثر ہوتا ہے۔ اور یہ سب صرف اس لئے کہ یہ مجالس اور جماعتیں کسی ایک اصول کے  
 پابند اور کسی ایک ملک میں منسلک نہیں۔ اتنے سالوں سے ہماری تعلیمی کانفرنسیں  
 ہوتی ہیں۔ یہ جلسہ بھی ایک قسم کی کانفرنس ہی ہے۔ جس میں صوبہ بھر کے قائم مقام  
 معززین تشریف لاتے ہیں۔ پھر کیوں ہم متفقہ تعلیمی پالیسی آج تک قائم نہیں کر سکتے؟  
 کیا یہ بات آپ کو کہہ سکتی نہیں کہ ایک اسلامی سکول کسی روش پر چل رہا ہے۔ اور  
 ایک کسی پر؟ ایک کو روپیہ ملتا ہے تو عمارت بنالیتا ہے اور کہتا ہے کہ پڑمائی کا خدا حافظ  
 اور دوسرے کو روپیہ ملتا ہے تو پڑمائی کی کچھ فکر کرتا ہے اور کہتا ہے۔ کہ عمدہ عمارت  
 مدرسے کے لئے کچھ ضروری چیزیں ہی نہیں۔ ایک بے سرمایہ ہی چلا دیا گیا ہے اور دوسرا



سرمایہ کی انتظامیہیں تجویز کی حد سے یا پرامٹری کے درجہ سے اوپر نہیں جاسکتا ایک سرکاری امداد منظور کر کے چند قیود سخت کی پابندی منظور کر لیتا ہے تو دوسرا آزادی کو ترجیح دیتا ہے۔ ایک زیر معائنہ افسران سرکاری ہے اور دوسرا نہیں۔ ایک اصولی طور پر مسلمان اوستاد رکھتا ہے۔ اور دوسرا ہندو مسلمان دونوں۔ ایک میں تعلیم دینیات کم ہے۔ ایک میں زیادہ کسی اسلامی سکول سے طلبہ مڈل پاس کر کے انٹرنیشنل مشن یا گورنمنٹ یا آریہ سکولوں میں پاس کرنے جاتے ہیں اور کسی سے انٹرنیشنل پاس کر کے کالج غیر اسلامی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اگر آپ کے اس خیال میں کچھ جان ہے کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم سے بہرہ ور ہونا۔ مسلمانوں کے لئے ضرور ہے تو کیا یہ انتظام کہ ایک حد تک اس خیال کے مطابق شد بد پڑیں اور پھر جہاں جی چاہے چلے جائیں اور جو کچھ پڑتا ہے اُسے محو کر دیں۔ یا اُس پر ایک تہ اُس کے مخالف خیالات کے جمالیں۔ کبھی تسلی بخش انتظام سمجھا جاسکتا ہے؟ کیا یہ ضروری تھا۔ کہ اسلامی مدارس کی تعلیم کا کم از کم یہ اثر ہو۔ کہ اُن کے طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی اسلامی تعلیم گاہوں میں جائیں؟۔ مڈل سکول سے طالب علم نکل کے کسی دوسرے قریب ترین شہر کے اسلامیہ ہائی سکول میں داخل ہونے کو مقامی مگر غیر اسلامی مدرسہ پر ترجیح دیں۔ اور انٹرنیشنل پاس کر کے یا علیگڑھ کالج میں یا اسلامیہ کالج میں آئیں۔ کیا اس قسم کی کوئی قرار داد کسی دو اسلامیہ مدارس کی ایک دوسرے کے ساتھ ہے؟۔ اور کیا ایسی قرار داد کی غیر موجودگی میں ہم آپ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ایک تعلیم کے معاملے میں بھی ہم اُسی راہ پر اور اُس رفتار سے چل رہے ہیں۔ جس راہ پر اور جس رفتار سے ہمارے ہندو ہمسائے جا رہے ہیں؟ یہاں کے آریہ کالج کو دیکھئے۔ اور اپنے اسلامیہ کالج کو دیکھئے۔ اس بات کا کالان کے ہاں بہت زیادہ سرمایہ کالج کے کام کے لئے دیا گیا ہے۔ اور یہاں کالج شروع سے اب تک عملاً نادر ہے اور آئی تو روزی اور نہ آئی تو روزہ کی حالت میں ہے۔



شاید یہ جواب دیا جائے۔ کہ وہ قوم نسبتاً امیر ہے۔ گو یہ امر واقعہ ہے۔ مگر کالج کے سرمایہ  
 کی زیادتی کا یہ سبب نہیں۔ کیونکہ میں نے اُریہ کالج کے کئی سالانہ جلسے دیکھے ہیں۔ کسی  
 جلسہ میں اس سے زیادہ نامور اور ذمی جاہ لوگ بیٹھے کیجا نہیں پائے۔ جتنے آپ کے  
 پروگرام میں موجود ہیں اُریہ کالج کے سرمایہ کا دار و مدار زیادہ تر اسی چندہ پر ہے جو اُسے تعلیم  
 یافتہ طبقہ سے ملتا ہے۔ ہندو ساہوکار اور امرا بالعموم سناتن دھرم کے ہیں۔ اور وہ  
 اُریہ دھرم کی مدد نہیں کرنا چاہتے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہندو ایشیا کی خاصیت  
 میں ہم سے بڑھے ہوئے ہیں اور زیادہ حوصلہ سے دیتے ہیں دوسرے یہ کہ ہمارے ہاں  
 پڑھے لکھے آدمیوں میں بھی ایسے بہت ملیں گے۔ جو کالج کو محل خیرات تو سمجھتے نہیں اس  
 لئے اس بات میں متامل ہیں۔ کہ آیا اس میں روپیہ دینا ثواب ہے یا نہیں۔  
 محض چندہ اور تادان سمجھ کر کچھ دے ڈالتے ہیں۔ درنہ وہ شوق جو مسلمانوں کو  
 از روئے مذہب خیرات کے متعلق ہے اس کی امداد میں عام طور پر نہیں دکھایا  
 جاتا۔ خیراً آپ سرمایہ کے مقابلہ کو جانے دیجئے۔ اور ویسے دیکھئے۔ وہاں بھی ایسی  
 معلم یہاں بھی۔ وہ اصولی طور پر انگریز معلم لینا ہی نہیں چاہتے۔ ہم اس بات  
 کے خواہشمند ضرور ہیں۔ کہ کم از کم ایک انگریز عالم ہمارے کارخانہ میں مزید خوبی  
 پیدا کرنے کے لئے ہمیں مل جائے۔ دو دو جگہ معلموں کے مبلغ علم عموماً یکساں۔  
 فیس قریب قریب یکساں۔ اس پر وہاں تعداد طلبہ ایک ایک جماعت میں ایک  
 ایک سو سے اوپر۔ لاہور کے سب کالجوں سے بڑھ کر اور یہاں سب سے کم۔ کیوں؟  
 اس لئے کہ وہاں کیا لڑکوں کے والدین اور کیا آریہ مدارس کے مدرسین اس بات  
 پر متنبہ ہوئے ہیں کہ لڑکوں کو اپنے کالج میں بھیجیں۔ اور یہاں ہر شخص ابتدا سے  
 ہی اپنے کالج کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور کسی اور کے لڑکے پر کالج کی  
 قابلیت کا تجربہ کر کے دیکھنا چاہتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اپنے لڑکے کو پھر بھیجوں گا۔



اگر کلج کامیاب ثابت ہوا۔ ایف۔ اے میں متواتر کئی سالوں تک نتیجہ کلج لانے  
 اطمینان بخش دکھائے۔ اس پر بھی تعداد طلبہ بچپن میں سے نہ بڑھی۔ کچھ عرصہ  
 ہوا بی۔ اے کا درجہ کہو لا گیا۔ خود ہمارے ہاں کے اچھے لڑکے اس میں نہ بھیجے گئے۔  
 ہماری مینا سے ہی تلچھٹ ہمارے حصے میں آئی۔ جس کی تلخ کمانی گزشتہ سال  
 کے بی۔ اے کے نتیجے میں ہم اٹھا چکے ہیں اور نہ معلوم کب تک اٹھائیں۔ کیونکہ گزشتہ  
 سال کے بی۔ اے کا نتیجہ پھر نہ صرف نئی بی۔ اے کی جماعت پر پڑا۔ بلکہ ایف۔  
 اے کے پہلے سال کی جماعت میں بھی پہلے سالوں سے تعداد میں بھی کم طلبہ آئے اور  
 اعلیٰ قابلیت کے بھی اتنے طالب علم نہ آئے۔ جتنے پچھلے سالوں میں آتے رہے تھے  
 اور اس کا اثر دیر تک اس تعلیم گاہ پر رہے گا۔ اگر ذرا بھی غور سے اور انصاف  
 سے دیکھنے والی نگاہیں قوم میں پیدا ہو گئی ہوتیں۔ تو پچھلے سال میں جو نمایاں نتیجہ  
 ایف۔ اے کا تھا۔ اس کو دیکھ کر ایف۔ اے کی جماعت میں طلبہ کی وہ بھرمار ہوتی  
 کہ جگہ نہ ملتی۔ خواہ بی۔ اے میں کم آتے۔ پٹنری تو موجود ہو جاتی۔ جس سے آئندہ  
 پودے بیٹنگے۔ اب پھر یونیورسٹی کے امتحانات قریب ہیں۔ ایف۔ اے۔ کی  
 جماعت پھر یہ کلج بہت کچھ وثوق کے ساتھ بھیج چکا ہے۔ گو بی۔ اے کی طرف  
 سے بھی قطعی ناامید نہیں۔ خیر یہ تو نتیجہ پر ظاہر ہو گا۔ کہ کیا ہوتا ہے۔ میرا مطلب اس  
 ضمنی تذکرہ سے صرف یہی ہے۔ کہ ہمارے ہاں کسی کارخانہ کا امتحان بھی تو منصفانہ  
 طور پر کرنے والے نہیں۔ اور وہ طور یہ ہے کہ کارکنوں کو پورا موقعہ کام دکھانے  
 کا دیا جاوے۔ ان کے لئے مناسب سامان اور معتد بہ سرمایہ مہیا کیا جاوے۔  
 پھر اگر وہ پورے نہ اتریں۔ تو بیشک ان پر الزام ہو۔ اگر آپ کارگیروں کو نہ سالہ  
 بہم پہنچائیں اور نہ اوزار تو کیا ہو سکتا ہے۔ اوزار میں سب سے ضروری چیز تو زر  
 ہے۔ وہ دل کہو لکھو تکیے۔ اور سالہ ایسے کارخانوں کے کارگیروں کے لئے طلبہ ہیں



جن کے متعلق میرا یہ خیال ہے۔ کہ سب اسلامی مدارس میں کچھ تعلقات اور قرار  
 دادیں ہونی چاہئیں۔ کیونکہ موجودہ متفرقہ صورت میں صرف ایک مروجہ تعلیم  
 کے صیغے میں بھی وہ ترقی جو ہمیں درکار ہے۔ حاصل کرنی مشکل نظر آتی ہے۔  
 اس سلسلہ گفتگو میں میں خوشی سے اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ یہ خیالات بعض  
 مقامات کے دورانِ شیش ہمدردانِ قوم کے دلوں میں کچھ عرصے سے گزر رہے  
 ہیں اور انہوں نے یہ ارادہ کیا ہے۔ کہ لاہور کو پنجاب کے صوبہ کے لئے اسلامی  
 تحریکوں کا مرکز قرار دے کر لاہور کے ساتھ مستقل روابط اپنی انجمنوں کے قائم  
 کریں۔ اس خیال میں سب سے مقدم ہوشیار پور کی انجمنِ اسلامیہ ہے۔ اور  
 اس انجمن کے ساتھ ان کی خط و کتابت اس بارہ میں ہو رہی ہے۔ خدا کرے  
 کہ اس سے مفید نتائج نکلیں۔ راولپنڈی میں بھی چند نہایت مستعد اور باصلاحیت  
 کارکن حضرات کی بدولت ایک خاصہ وسیع حلقہ اس انجمن کے مستقل ممبروں اور  
 ہمدردوں کا پیدا ہو گیا ہے۔ جو اپنی ہمدردی کو مقامی حدود سے باہر تک پہنچانے  
 پر آمادہ ہے مگر اس کے ساتھ مقامی کوششوں میں بھی سرگرمی سے شریک ہو  
 اور یہی مذاق ہے۔ جس کے پیدا کرنے اور بڑھانے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک  
 مجھے معلوم ہے یہ مذاق گوداں پہلے ہی موجود تھا۔ مگر بالفعل ایک ایسے دوست کی  
 ان تہک محنت سے پیدا ہوا ہے۔ جس نے گزشتہ سال اسی جلسہ میں دہان  
 انجمن کی طرف سے آنریری طور پر کام کرنے کا عہد کیا تھا اور اس کو مردانگی کے  
 ساتھ پورا کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج کے بکچر کا اتنا نتیجہ تو ضرور ہو کہ اور ضلع  
 پنجاب میں بھی ایک ایک ایسا رکن اس انجمن کا موجود ہو جائے جو اس کی ہمدردی کو  
 تازہ رکھے اور حلقہ ممبران وسیع کرتا رہے۔ اور میں سمجھوں گا کہ مجھے اپنی محنت  
 کا صلہ مل گیا۔ اگرچہ ضلعوں کی طرف سے بھی ایسے کارکن اس وقت بول اٹھیں جیسے



ہمارے راولپنڈی والے دوست ہیں۔ کیونکہ جس طرح تفرقہ ہماری منزل کے لئے سدا رہا ہے۔ اسی طرح اجتماع اس راستے کے لئے سب سے بڑی سہولت ہے اور اجتماع کی ترکیب یہی ہے۔ کہ ہم سب ایک سلسلہ میں مربوط ہوں۔ خواہ آپ اس کام کو ضلع دار شروع کریں۔ خواہ قسمت دار خواہ صوبہ دار۔ آخر آپ کو سارے ہندوستان کو احاطہ کرنا ہوگا۔ اگر آپ بحیثیت مجموعی ترقی کرنا چاہتے ہیں تو یہی ایک تدبیر ہے۔ جو میرے خیال میں ہماری حالت کو بدل سکتی ہے اور جو جو وسائل کسی کے ذہن میں آئیں اس مطلب کے حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنے چاہئیں اور سب اغراض پر اس عرض کو مقدم رکھنا چاہئے۔ جو باتیں تفرقہ انداز ہوں انہیں اگر کچھ فائدہ بھی ہو تو انہیں قوم کی موجودہ حالت میں ترک کرنا چاہئے اور جو تفرقہ دور کریں۔ انہیں تھوڑا سا نقصان اٹھا کر بھی قبول کرنا چاہئے۔ یہی ایک ذہن ہے۔ جو یہی خواہاں قوم کے سر میں سما جانی چاہئے۔ اور یہی ایک خیال ہے جو ان کے دلوں پر قابض ہو جانا چاہئے۔

مصلحت دید من آست کہ یاراں ہمہ کار

بگزارند و سر طرہ یارے گیرند

یہاں تک یہ بیان ہو چکا کہ ہم باعتبار تعلیم مروجہ کے اور باعتبار قوت اجتماع کے ابھی منزل مقصود سے کس قدر دور ہیں اور کتنی کوشش مطلوبہ مدت تک سائی کے لئے درکار ہے۔ اب اس تقریر کے اختتام سے پہلے سرسری طور پر پریشادہ کر دینا ضروری ہے۔ کہ کتنے اور بیغے ہیں جن میں ہماری حالت صفر کے برابر ہے اور جن کا آغاز کرنے کا وقت آگیا ہے۔ سب سے مقدم ذکر صنعتی تعلیم کا آتا ہے۔ جس کے متعلق ہمارے ہاں کوئی تحریک نہیں اور اس کا سبب یہی ہے۔ کہ جب قوتیں ہی منتشر ہیں تو نتیجہ ہر مقام میں خاطر خواہ نہیں۔ اور جب سرمایہ معمولی مدارس کے



لئے کافی نہیں۔ تو صنعتی مدارس کا کیا ذکر۔ حالانکہ ان کی ضرورت ملک میں اب مستم  
ہے۔ اور حریف ہو گا۔ اگر اس کی طرف بھی مسلمان اس وقت توجہ کریں گے۔ جب میدان  
تنگ ہو چکے گا اور مقابلہ سخت ہو جائے گا۔ ہمارے ہندو ہموطنوں نے اس بار میں  
بھی ایک قابل تقلید مثال لاہور میں ایک چھوٹا سا صنعتی مدرسہ قائم کر کے پیدا  
کر دی ہے۔ اور اگر نصیحت اور مثال دونوں ہمارے لئے کافی نہ ہوئیں۔ تو آخر  
افصح المودین (زمانہ) کے طمانچے تو کہیں گئے نہیں۔ ہم سید ہے تو ہو جائیں گے  
مگر یہ دنیا کو دکھا دیں گے۔ کہ مدرسے کے ڈھیلے لڑکے کی طرح دھول دھتے اور گوشمالی  
کے بغیر ہم کسی کام کے نہیں۔ صنعتی تعلیم کے متعلق فن انجینیری کے اعلیٰ  
امتحانات میں مسلمانوں کا قریب قریب مفقود ہونا نہایت قابل اسفوس ہے اور  
یہ صیغہ صاحبان توفیق کی مدد کا سخت محتاج ہے۔ کیونکہ عموماً گمٹی ہو نہ ہاں مسلمان  
محض مالی مشکلات کے سبب سے رُڑکی کالج کے اخراجات کے متحمل نہ ہو کر اس  
صیغے میں جانے سے رہ جاتے ہیں۔ اور اس کے لئے خاص وظایف قائم ہونے  
کی بہت ضرورت ہے۔ اہل کرم کو میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ غریب مسلمان طلبہ  
کو وظایف دیکر مختلف علوم و فنون میں انکے لئے تعلیم و تربیت مہیا کرنا اور انکو سونپنے  
کے مفید کن اور معزز مسلمان بنانا ایک خیر جاری ہے۔ جسکی تعریف میں  
جس قدر مبالغہ کیا جائے کم ہے۔ اور جو لوگ اس طرح کی خیرات کر جائیں گے۔  
موجودہ زمانہ کی تاریخ میں ان کی اس خیرات کا تذکرہ فخر کے ساتھ یادگار رہے  
گا۔ کہ ایسے لوگ بھی تھے۔ جنہوں نے گرتے ہوؤں کو سنبھالا۔

برین رواق زبرجد نوشتہ اند بہر

کہ جز نکوئی اہل کرم نخواہد ماند۔

اس کے بعد تجارت کو لیجے۔ اس نے نئی صورت اس زمانہ میں اختیار کی ہے اور شکر



سرمایہ کے ذریعے سے تعجب خیز نتائج پیدا کر رہی ہے مگر اس میں ابھی ہم نے منزل کی طرف قدم ہی نہیں اٹھایا اور اس سے اگر بہت دیر تک غافل رہے۔ تو نہ پڑمانی۔ نہ ملازمت کوئی چیز ہمیں اس بد قسمتی سے بچانے سکے گی جو آج کل ان اقوام کے حصے میں آگئی ہے۔ جو صنعت و تجارت سے غافل ہیں۔ وہ بھی ثروت جو ملازمت میں بسبب اپنی حکومت ہونے کے روم کے مسلمانوں کو ابھی حاصل ہے۔ مگر تجارت اور صنعت کے زور و پر کی قومیں انکے گہر میں وہ اثر رکھتی ہیں۔ خود انہیں حاصل نہیں۔ مولانا حالی مدظلہ نے اب کے دہلی میں ایک دلگداز نظم لکھتے ہوئے قوموں کی ترقی اور منزل کے متعلق جو نہ ٹلنے والا قانون قدرت جاری ہے۔ اس کا کیا خوب اعلان کیا ہے +

جو بڑے کا حوصلہ اس کا بڑھایا جائیگا

جو گرے گا اپنے رتبے سے۔ گرایا جائیگا

یہ دو مصرعے نہیں ہیں۔ ایک آواز غیب میں جو سچائی کے جوہر معمولی سید ہے سید ہے الفاظ کے پردہ میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اور ایک سن رسیدہ تجربہ کار اور اہل دل بزرگ قوم کی زبان سے نکلے ہیں۔ اگر ہمیں کچھ مہنا ہے تو یہ تہنہ اور ایسی اور تہنہیں ہمارے دلوں پر اثر کر جائیں گی اور اگر خدا نخواستہ کچھ اور انجام ہے تو خیر بدستور غفلت طاری رہے گی۔ صنعت اور تجارت ہی پر کیا حصر ہے۔ ترقی کی اور کتنی شاخیں ہیں جن میں ہم کسی شمار قطار میں نہیں۔ کوئی جماعت ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے نہیں۔ اخبارات ہمارے ابھی تھوڑے اور ضعیف اور مدد کے بہو کے۔ لکچر ہمارا ابھی ترقی کا محتاج تمدنی حالت ہماری ابھی سمجھانے کے قابل۔ قصہ مختصر جدھر نظر اٹھا کر دیکھیں یہی نظرات ہیں۔ کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اسی لئے میرا خیال ہے۔ کہ "کرنا باقی ہے" کی صدا



چاروں طرف سے بلند ہونی چاہئے اور بجائے اس کے کہ اس کا اثر پستی ہمت ہو  
 ہمیں اور تہمت زیادہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ اگر ہم اپنی مدد آپ کرنے لگیں گے تو خدا کی  
 رحمت کا ہاتھ ہم پر سایہ ڈالے گا۔ اور اسلام کے پاک بانی کی مقبول دعائیں ہمارے  
 حق میں ہونگی۔ اور صلحا کی روحیں ہماری ہوا خواہی کریں گی۔ تاریک راہ جو ہمیں  
 درپیش ہے روشن ہونے لگے گی۔ اُس کی دشواریاں آسانیاں بنتی جائیں گی  
 اور منزل کی دوری تبدیل بہ قرب ہو جائے گی۔

دریا بیاں گر بہ شوقِ کعبہ خواہی ز قدم + سر ز نشہا گر کند خارِ معیناں غم مخور  
 گرچہ منزل بس خطرناکست و مقصد ناپید بی بیج را ہے نیست کو رہ نیست پایاں غم مخور